خیبر پختونخوا کے اردو افسانہ میں منتخب عسرت زدہ کرداروں کا تحقیقی جائزہ

☆سردار علی پی ایچ ڈی سکالر (شعبہ اُردو جامعہ پشاور)
☆☆ڈاکٹر فرحانہ قاضی ایسوسی ایٹ پروفیسر (شعبہ اُردو جامعہ پشاور)

Abstract:

Khyber Pakhtunkhwa is comprised of lush green valleys with high altitude mountains blanketed with a variety of flora and containing diversity in fauna and four different seasons each with its own colours and fragrance. This area also flourished the famous Gandhara civilization in its lap. However, this region is also assumed a backward and underprivileged area in Pakistan economically. However, privileged class of the region occupy sixty percent of the total resources and land. For this reason, a large proportion of the population of this region is compelled to live poor and substandard lives. Since literature is the reflection of a society, hence, the writers of this region have penned works on this serious issue of economic backwardness in form of fiction. Such dominant writers include; Farigh Bokhari, Fehmeeda Akhter, Mrs. Munawwar Rauf, Sahar Yousafzai, Syeda Hina, and Dr. Akhter Nawaz Khan. These writers have produced a considerable body of literature that contain especially the theme of regional issues of the unprivileged elements of the Pashtoon society. Thus, this work deals with the fictions of these writers dealing with issues of economical backwardness and poverty in special.

Keywords: Pashtoon society, fiction, economic backwardness, dominant writers

کلیدی الفاظ: خیبر پختونخوا، اردو افسانہ، پس ماندہ طبقہ، معاشی، سماجی اور مذہبی مسائل، دہشت گردی، غربت۔

خیبر پختونخوا پاکستان کا ایک پسماندہ اور علمی حوالے سے ترقی پذیر صوبہ ہے۔ اس خطے کے ادباء نے مقامی وسائل کے غیر منصفانہ تقسیم کو دیکھتے ہوئے اس سماجی ناانصافی کے خلاف آواز بلند کی ہے۔ خصوصاً اردو افسانہ میں اس سماجی شعور کو اجاگر کرنے کے لیے تواتر کے ساتھ فن پارے وجود پا چکے ہیں۔ جاگیر دارانہ نظام کی وجہ سے مقامی سطح پر موجود غربت کو اجاگر کرنے والوں میں فارغ بخاری، رضا ہمدانی، طاہر آفریدی، سحر یوسف زئی، فہمیدہ اختر، مسز منور رؤف، اختر نواز خان اور گلشاد انصاری کے نام بے حد اہم ہیں۔ رضا ہمدانی نے افسانہ "غوبل" میں گلاب کاکا کا کردار بڑی فن کاری سے تراشا ہے۔ گلاب کاکا ایک عسرت زدہ کسان ہے۔ جو کھیتوں میں کام کر کے بیوی بچوں کا پیٹ پال رہا ہے۔ تاہم اس کا ذہن اس ناانصافی کے خلاف بیدار ہو چکا ہے کہ علاقے کا زمیندار کف در دہان خان بغیر محنت مشقت کے، ان کسانوں کی محنت کا ثمر بٹائی کے دن، گھر لے جاتا ہے۔

گلاب کاکا کے خیالات کو اس کے مندرجہ ذیل مکالمے سے سمجھا جا سکتا ہے:

"لیکن کب تک نہیں مانے گا؟ آخر انصاف بھی کوئی چیز ہے یا نہیں ۔۔۔۔۔ کیا مسلمانی یہی ہے جو خان کرتا ہے ۔۔۔۔ دن رات پوہ ماگھ کی سردی اور ہاڑ کی تپتی ہوئی گرمی میں تو کسان ٹھٹھریں اور جلیں، لیکن فصل تیار ہونے پر وہ دو دن پیٹ بھر روٹی بھی نہ کھا سکیں۔"(۱)

ان انقلابی خیالات کا حامل گلاب کاکا جب گاؤں کے جاگیردار کے سامنے ڈٹ جاتا ہے، تو گاؤں کا خان، اُس کے مذکورہ مزاحمت کو کچلنے کے لیے، اپنے وفادار غندل کی سرکردگی میں چند مسلح غنڈوں کو گاؤں کے عسرت زدہ کسانوں کی طرف روانہ کرتا ہے۔ غندل اگرچہ خان کا خاص کارندہ اور وفادار ہے، لیکن غنڈوں کی فائرنگ کے نتیجے میں گلاب کاکا اور دیگر عسرت زدہ کسانوں، عورتوں اور بچوں کی موت کو دیکھ کر اُس کا ضمیر جاگ اٹھتا ہے۔ اب غندل اس بربریت کے حوالے سے اُن غنڈوں کے ضمیروں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔ یوں غندل اور مسلح غنڈے اپنی غلطی کے تلافی کرنے کے لیے خان کے محل میں گھس کر تمام افراد کا خاتمہ کر دیتے ہیں۔ اس خونی تصادم کے نتیجے میں گاؤں کے کسان کھیتوں کے مالک بن جاتے ہیں۔ یوں ان کی زندگی میں خاشحالی آجاتی ہے۔ رضا ہمدانی کے اس فن پارے پر مثالیت پسندی کے ثرات نظر آتے ہیں۔

فہمیدہ اختر خیبر پختونخوا کی ایک حساس اور بالغ النظر فن کارہ ہے، انہوں نے اپنے فن پاروں میں ایک طرف بورژوا طبقے کی عیاشیوں اور سہولیات کو بیان کیا ہے، تو دوسری طرف غربت زدہ طبقے کے معاشی مسائل پر بھی، اُس کی نظر بے حد گہری ہے۔ افسانہ "شاداب وادی کا ہیرو" کا مرکزی کردار زمان نامی ایک چھوٹا لڑکا ہے، جو غربت و عسرت کی وجہ سے بھیک مانگنے پر مجبور ہو چکا ہے، کیونکہ اُس کا باپ ایک معمولی رقم کے عوض نوکری کرتا ہے اور اس کی ماں گائے اور بھینس پال کر گھریلو اخراجات پوری کرنے میں دن رات محنت کرنے میں مگن ہے۔ والدین کے بوجھ کو ہلکا کرنے کے لیے زمان نتھیا گلی آنے والے مالدار سیاحوں سے بھیک مانگ کر روپے جمع کرتا ہے۔ بعض اوقات وہ بے چارہ چاندنی راتوں میں بھی سیاحوں کے ارد گرد منڈلاتا رہتا ہے۔ یوں وہ بے چارہ کھلے آسمان تلے رات بسر کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ زمان اگرچہ چھوٹا لڑکا ہے لیکن غربت نے اُس کو وقت سے پہلے ہی بوڑھا اور ذمہ دار بنا دیا ہے۔ وہ نہ صرف اپنے والدین کی غربت کا شدید احساس رکھتا ہے بلکہ وہ دیگر عسرت زدہ بھکاری بچوں کے والدین کا بھی خیر خواہ ہے۔ مندرجہ ذیل اقتباس سے زمان کی انسان دوستی کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

"جی یہ چڑھائی چڑھ کر بنگلوں میں تو جا نہیں سکتے۔ گھر سے یہاں پہنچتے ہی تھک جاتے ہیں تو میں انہیں گرجے کے سامنے بیٹھا جاتا ہوں تاکہ ہر آنے جانے والے

سے پیسے مانگیں۔ مگر یہ نیچے چمن میں جھولا جھولنے والوں کا تماشہ دیکھتے رہتے ہیں۔
"

"چھوٹے ہیں نا بے چارے۔"
"جی جب انہیں پیسے ملیں اور میں قریب نہ ہوں تو یہ فوراً کچھ خرید کر کھا جاتے ہیں۔"
"اور جب تم قریب ہوتے ہو تو؟"
"تو میں ان سے پیسے لے لیتا ہوں اور ان کی ماں کو دے دیتا ہوں۔"(۲)

زمان نقلی مونچھوں اور داڑھی کے ذریعے بہروپ بدل کر مالدار لوگوں سے بھیک مانگنے پر مجبور ہے، کیونکہ کم عمری ہی میں اس کے ذمے گھریلو اخراجات میں ہاتھ بٹھانا حصے میں آیا ہے۔ مسز منور رؤف خیبر پختونخوا کے اردو افسانہ کا ایک معتبر حوالہ ہے۔ موصوفہ نے خطے کے دیگر مسائل وہ محاسن کے علاوہ غربت کے برے اثرات کا تجزیہ بھی فنکاری سے کیا ہے۔ افسانہ "زندگی پر موت کا کتنا بڑا احسان ہے" کا مرکزی کردار ریشماں نامی خاتون ہے۔ ریشماں کا شوہر شدید برف باری میں بھی بیوی بچوں کی کفالت کے لیے مزدوری کی غرض سے گھر سے نکلا ہے۔ رات گئے گھر واپس لوٹ کر نہ آنے کی وجہ سے ریشماں بچوں کو بھوکا گھر میں بند کر کے روانہ ہو جاتی ہے۔ تاہم شوہر کی تلاش میں وہ شہر جا پہنچتی ہے۔ وہاں دولت مند گھرانوں کے بچوں کی آسائشات اور سہولیات دیکھ کر الجھن میں پڑ جاتی ہے۔ وہ اپنے بچوں کے بھوک مٹانے کے لیے ان امراء کے دروازوں پر دست سوال دراز کرتی ہے، لیکن مکینوں کی طرف سے اس کو دھتکارا جاتا ہے۔ مایوسی کی حالت میں ریشماں اپنے گھر کی طرف روانہ ہو جاتی ہے، لیکن اب اس کے ذہن پر شدید مایوسی کا غلبہ ہو چکا ہے۔ اس حد درجہ مایوسی کی حالت میں وہ ایک جگہ برف پوش وادی میں کچھ افراد کو دیکھ کر قریب چلی جاتی ہے۔ وہاں پہنچ کر اس پر یہ راز کھل جاتا ہے کہ اس کے شوہر (سرور) کی لاش پڑی ہوئی ہے، ریشماں یہ منظر دیکھ کر شدید یاسیت سے دوچار ہو جاتی ہے۔ وہ خاموشی سے گھر کی طرف روانہ ہو جاتی ہے اور کہانی کا انتہائی تلخ انجام وقوع پذیر ہو جاتا ہے۔ کہانی کا اختتامی حصہ ملاحظہ ہو:

"شام سے پہلے پہلے ریشماں بچوں کو لے کر پہاڑ کی چھوٹی پر پہنچ چکی تھی۔ اس نے پہلے بڑے بچے کو گود میں اٹھالیا۔ اس کو جی بھر کر پیار کیا۔ پھر پیار کرتے کرتے اچانک اسے فضا میں ہی اچھال دیا۔۔۔۔ بچے کے منہ سے ایک چیخ نکلی اور وہ ہمیشہ کے لیے پہاڑ کی عمیق ترین گھاٹیوں میں گم ہو گیا۔۔۔۔۔ !! پھر اس نے دوسرے بچے کو اسی طرح گود میں اٹھایا۔۔۔۔۔۔ جی بھر کے پیار کیا وہ ابھی "روٹی"۔۔۔۔۔۔، "بھیا"۔۔۔۔۔ اور "بابا" کو یاد کر ہی رہا تھا۔ کہ اس نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی اسی بھی کھڈ کی گہرائیوں میں دھکیل

> دیا۔۔۔۔۔!! اور آخر میں کمر سے بندھے ہوئے مردہ بچہ کو مضبوطی سے باندھا اور یہ کہتے ہوئے۔۔۔۔۔۔"میں ہی بدنصیب اس دنیا میں غم کھانے کے لیے کیوں زندہ رہوں۔"! ریشماں نے آنکھیں بند کر کے خود بھی چھلانگ لگا دی۔"(۳)

کہانی کا یہ انجام بڑا ہی دہشت ناک ہے۔یوں قاری کے ذہن میں یہ سوال لاشعوری طور پر اٹھتا ہے کہ انسان کا قائم کردہ یہ معاشی نظام افراد سے جینے کا حق چھین کر موت کے منہ میں دھکیل دیتا ہے۔یوں بہ انداز دگران افراد کو قتل کر دیا جاتا ہے۔یہ اور بات کہ معاشرے کے نام نہاد شرفاء اس طرح واقعات پر مگرمچھ کے آنسو بہا کر معمولی رقم خرچ کر کے، سماجی کارکن بن کر عوامی حمایت حاصل کر کے، خود پر ظاہرداری اور نیکی کا خول چڑھانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

ڈاکٹر اختر نواز خان اپنے سینے میں ایک پر درد دل رکھتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے افسانوں میں متعدد خستہ حال کرداروں کو فنکاری سے پیش کیا ہے۔افسانہ "مائی جنتو" کا مرکزی کردار مائی جنتو ایک عسرت زدہ مزدور خاتون ہے۔بھٹہ خشت میں کام کرنے والی مائی جنتو کا شوہر "چاچا گابو" بھی محنت مزدوری کر کے غربت زدہ زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے۔نئے بجٹ کے آنے پر حکومت کے خوش کن اعلانات کو سن کر سادہ لوح مائی جنتو سہانے مستقبل کے سپنے دیکھ کر خوش ہو جاتی ہے۔وہ مزدوروں کو یقین دلانے کی کوشش کرتی ہے کہ حکومت کا "غربت مکاؤ پروگرام" بڑا ہی کامیاب ثابت ہوگا۔یوں ہمارے دن پھر جائیں گے تاہم بھٹہ خشت کا بابو طارق مائی جنتو کا شیش محل اس وقت چکنا چور کر دیتا ہے جب وہ مائی جنتو سے کہتا ہے کہ حکومت کی طرف سے اکیس ارب روپے سے کیا ہو گا؟ وہ کہتا ہے کہ:

> "اکیس ارب روپے کو اگر ساڑھے چار کروڑ افراد میں بانٹا جائے تو ہر ایک مستحق کے حصے میں سالانہ چار سو سات روپے آئیں گے۔یعنی ۳۴ روپے فی کس۔"(۴)

اس حقیقت کے کھل جانے پر مائی جنتو سمجھ جاتی ہے کہ ہمارا نظام عام فرد کو خوش کن خواب دکھا تو سکتا ہے، لیکن ہمارے رہنما غرباء کی حالت بدلنے کے حوالے سے مخلص ہر گز نہیں۔مصنف نے ہمارے معاشی وسیاسی نظام پر گہرا طنز کیا ہے۔جہاں چند خاندان ہی تمام وسائل پر قابض ہیں۔سحر یوسف زئی نے افسانہ "کمبل" میں وادئ سوات کی خوبصورت وادی میں موجود غربت کا احاطہ کیا ہے۔اگرچہ یہ وادی سیاحوں کے لیے پاکستانی سوئٹزرلینڈ کی مانند حسین ہے، لیکن وہاں کے باسی شدید غربت سے دوچار ہیں۔کہانی کا مرکزی کردار لاجرا اگرچہ دن رات محنت کرتا ہے، لیکن پھر بھی وہ غربت زدہ زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے۔وہ ایک چرواہا ہے، اس کی غربت وہ حسرت کا نقشہ مصنف نے یوں کھینچا ہے:

> "اس کے پاس یہی ایک جوڑا تھا، جسے وہ پہنے ہوئے تھا اور پہاڑی جھاڑیوں نے اسے بھی جگہ جگہ سے پھاڑ دیا تھا۔اس کے پاس سوئی دھاگہ نہیں تھا۔اس لیے گانٹھیں دے کر پھٹے ہوئے حصے کو جوڑ رہا تھا۔مگر اب تو شلوار میں گانٹھیں اتنی

بڑھ گئی تھیں کہ شلوار نہیں رہی تھی، بلکہ بہت ہی تنگ ہو گئی تھی رات کو اتارنے
اور صبح پہننے میں اسے کافی وقت لگانا پڑتی تھی۔ اس کے پاس دوسرا جوڑا خریدنے
کے لیے پیسے کہاں تھے؟"(۵)

لاجبر شدید سردی میں اپنا کام جاری رکھنے کے لیے ایک گرم کمبل بنانے کا متمنی ہے، جس کے لیے وہ بھیڑوں کا اون جمع کرتا ہے۔ تاہم اس کی ماں، مذکورہ اُون کو فروخت کر کے، اشیائے خورد نوش لے کر، لاجبر کی خواہش کا خون کرتی ہے۔ لاجبر اگرچہ جوان ہے اور برسر روزگار ہے لیکن پھر بھی غربت کے ہاتھوں مجبور ہے۔ وہ پشمینہ نامی لڑکی سے محبت کرتا ہے اور پشمینہ کو بھی اس سے محبت ہے، لیکن مالی تنگدستی کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ شادی کرنے سے قاصر ہے۔ مصنف کا مؤقف یہ ہے کہ وادئ سوات سے دیگر علاقوں کے لوگ سیاحت کے لیے آکر لطف اٹھاتے رہتے ہیں، تاہم اس علاقے کے باسی غربت کی وجہ سے ان حسین نظاروں اور صحت افزاء ہوا سے حظ اٹھانے سے محروم ہیں۔
قیوم مروت نے افسانہ "جانور" میں غریب خواتین کی جنسی استحصال کو موضوع بنایا ہے۔ فن پارے کا مرکزی کردار ریشم نامی معصوم نوجوان لڑکی ہے۔ وہ اپنی نانی مائی کنڑکاں کے ساتھ غربت زدہ زندگی بسر کر رہی ہے۔ چونکہ مائی کنڑکان بوڑھاپے کی وجہ سے بے حد لاغر ہو چکی ہے ،اس لیے ریشم گاؤں کی گلیوں میں بھیک مانگ کر گزر بسر کا سامان کر رہی ہے۔ ایک دن کچھ اوباش لوگ ریشم کو خیراتی رقم دینے کے بہانے ویرانے میں لے جاتے ہیں اور جنسی تشدد کے بعد اُس کو مار دیتے ہیں۔ مائی کنڑکاں کے اضطراب کو مصنف نے یوں بیان کیا ہے:

"عصر کی آواز مسجد سے بلند ہوئی تو مائی کنڑکاں نے اپنی لاٹھی سنبھالی اور لاٹھی ٹیکتی
ہوئی آہستہ آہستہ دروازے سے نکلی۔ کچھ دیر خاموش کھڑی رہی اور پھر لرزتی
ہوئی آواز میں اپنی پوتی ریشم کو آواز دی۔
"ریشم نہیں آئی۔ خدا خیر کرے۔ کہیں اسے کچھ ہو نہ گیا ہو۔"
یہ کہتے ہوئے مائی کنڑکاں کے چہرے کی جھریاں اور بھی گہری ہو گئیں۔"(۶)

مائی کنڑکاں کا خدشہ درست ثابت ہوا کیونکہ جانور نما انسان ریشم کا جسمانی و جنسی استحصال کر کے، بے دردی سے قتل کر گئے تھے۔ یوں ریشم کے توسط سے مصنف نے غربت کے نتائج اور سماجی قباحتوں کا احاطہ کیا ہے۔ زیتون بانو نے افسانہ "ایک آنے کا بیٹا" میں دلشاد نامی خاتون کی غربت کا خاکہ پیش کیا ہے۔ دلشاد شوہر کی موت کے بعد گاؤں سے بھاگ کر شہر آ جاتی ہے۔ کیونکہ دیور اُس کے اکلوتے بیٹے قمر گل کو قتل کرنے کے درپے تھا تا کہ وہ اُس کے جائیداد پر قبضہ جما سکے۔ دلشاد اپنے بیٹے کی وجہ سے شہر آکر گھریلو خدمت کے حصول کی کوشش کرتی لیکن اُس کو ہر جگہ سے کورا جواب ہی ملتا ہے۔ اُس کو اپنی نہیں بلکہ اپنے بیٹے کی فکر ہے۔ اس لیے ایک دن وہ یہ انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور ہو جاتی ہے :

"ایک دن جب میں بھوک سے نڈھال ہو رہی تھی ایک گھر میں بھیک مانگنے گئی۔
اس گھر میں بڑے مالدار لوگ رہتے تھے جو بے اولاد تھے۔ گھر کی مالکن سے میں

نے روٹی مانگی۔اس نے کہا کہ روٹی ختم ہے۔ پھر میں نے کہا کہ ایک آنہ ہی دے دو ۔اس نے کہا آنہ دے دو نگی، تم یہ اپنا بیٹا مجھے دے دو۔ میں نے سوچا کہ یوں دربدر لیے پھرنے سے بہتر ہے کہ قمر گل انہیں دے دوں۔ آرام سے رہے گا۔ تو میں نے بیٹا دے دیا اور اس نے ایک آنہ دیا۔ پھر وہ رو پڑی۔اور جب میں وہاں دوسرے دن گئی تو وہ لوگ نہیں تھے۔ کسی نے بتایا کہ ان کی بدلی کراچی ہو گئی ہے"۔(۷)

اپنے جگر گوشے کو غربت کے ہاتھوں مجبور ہو کر دلشاد نے فروخت تو کر دیا،
لیکن جدائی کے صدمے کو برداشت نہ کرتے ہوئے،دماغی توازن کھو بیٹھی۔
ڈاکٹر اختر نواز خان کا کردار مائی جنتو(افسانہ "مائی جنتو" مجموعہ:ایک ہی کہانی)
سیاسی خوش کن نعروں سے وقتی طور پر خوش تو ہو جاتی ہے، لیکن کچھ
عرصہ بعد ان سیاسی نعروں کے کھوکھلے پن کو جان کر رنجیدہ ہو جاتی ہے۔(۸)

غربت کے موضوع پر شمیم فضل خالق کا افسانہ "ابر کی زد میں ستارہ" ایک وقیع فن پارہ ہے۔ کہانی کا مرکزی کردار مولوی ظہیر الحق نامی شخص ہے۔ وہ مسجد میں امامت کے فرائض سرانجام دے کر اپنا گزر بسر کرتا ہے۔ فارغ وقت میں وہ دیگر قریبی مساجد میں بھی جا کر دین کے نشرو اشاعت کا اہتمام کرتا رہتا ہے۔ وہ ایک ہنس مکھ اور بااخلاق فرد ہے یہی وجہ ہے کہ وہ کثیر تعلقات استوار رکھتا ہے۔ کبیر نامی موچی جو غربت کی وجہ سے مسجد میں رہائش پذیر ہے، سے بھی مولوی صاحب کی جان پہچان ہے۔ کبیر اپنی غربت کی وجہ سے اپنی قسمت سے گلے شکوے کرتا رہتا ہے۔ مولوی صاحب اس کو پرامید رہنے کی تلقین کرتا ہے۔

ایک رات مولوی ظہیر الحق کے گھر محلے کی ایک نوجوان لڑکی آجاتی ہے۔ اس لڑکی کا نام عصمت ہے اور قریبی ہمسائے زرداد خان کی بیٹی ہے۔ وہ لڑکی مولوی ظہیر الحق کو بتاتی ہے کہ مجھے میرے والد خطیر رقم کے واسطے فروخت کرنا چاہتے ہیں۔ وہ مزید بتاتی ہے کہ جس مرد پر وہ مجھے فروخت کرنا چاہتے ہیں، اس کے ساتھ ایک نوکرانی آئی تھی جس نے مجھے یہ خبر دی ہے کہ یہ لوگ نوجوان لڑکیاں شادی کے نام پر خرید کر پھر طوائف بنا کر کمائی کرتے رہتے ہیں۔ عصمت بتاتی ہے کہ میں طوائف بننے کی بجائے نکاح کر کے باعزت زندگی بسر کرنا چاہتی ہوں ۔ عصمت کی باتوں میں سچائی کا اثر موجود ہونے کی وجہ سے مولوی ظہیر الحق اس کو پناہ دینے پر راضی ہو جاتا ہے۔ کافی غور کرنے کے بعد مولوی ظہیر الحق کبیر موچی سے عصمت کی شادی کا اہتمام کرتا ہے۔ اس موقع پر وہ زرداد خان اور محلے کے کچھ اکابرین کو دعوت دیتے ہیں۔ مولوی ظہیر الحق رازدارانہ طور پر زرداد خان کو تمام احوال سے آگاہ کرتا ہے۔ زرداد خان تمام احوال سن کر حد درجہ نادم ہو جاتا ہے۔ اب وہ مولوی صاحب کے کہنے پر عصمت کا رشتہ کبیر موچی سے طے کرنے پر راضی ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی بیٹی کو بطور جہیز کچھ رقم دیتا ہے جبکہ مولوی ظہیر الحق اپنا آبائی گھر کبیر اور عصمت کو بطور تحفہ دیتا ہے۔ یوں یہ جوڑا بخوشی اپنا گھر آباد کر لیتے ہیں۔ مصنفہ نے غربت کی وجہ سے لڑکیوں کو

فروخت کرنے کے سلسلے کو ختم کرنے کا پیغام دیا ہے۔ دوسری طرف مصنفہ نے مولوی ظہیر الحق جیسے فرشتہ صفت انسانوں کا جزیات کے ساتھ تذکرہ کیا ہے، جو ہر حال میں حق پرست اور انسان دوست ہوتے ہیں۔ مصنفہ نے کہانی کے توسط سے کبیر جیسے غربت زدہ نوجوانوں کا بھی احاطہ کیا ہے، جو نکاح کر کے اپنا گھر بسانا چاہتے ہیں، لیکن غربت درمیان میں آکر، ان کے حوصلے پست کرتی ہے۔ کہانی کے آخری حصے میں کبیر کی ندامت اور خوشی کو مصنفہ نے یوں بیان کیا ہے:

> "میرے رب! مجھے معاف کر دے۔ میں کیوں مایوس ہو گیا تھا۔ تیری رحمتوں کے خزانے لازوال ہیں، تو کریم ہے۔۔۔۔ تو رحیم ہے۔ تو نے مجھے میری طلب سے زیادہ دے دیا ہے۔ میں تیری رحمتوں سے مایوس ہو کر واقعی گناہ کا مرتکب ہو رہا تھا۔

موچی کبیر کے ذریعے مصنفہ نے نوجوان نسل کو ہمت اور خالق سے پر امید رہنے کا درس دیا ہے۔(۹)

محمود شوکت کا افسانہ "دوراستے" فرید نامی ایک عسرت زدہ نوجوان کی کہانی ہے۔ فرید مار پیٹ سے گھبرا کر یتیم خانے سے بھاگ جاتا ہے۔ راستے میں فضلو دادا سے ملاقات ہو جاتی ہے اور فضلو دادا ترس کھا کر فرید کو گھر لے آتا ہے۔ اب وہ فرید کو اسکول میں داخل کرتا ہے۔ تھوڑی بہت تعلیم حاصل کرنے پر فرید ایک کارخانے میں ملازم ہو جاتا ہے۔ ملازمت پر گھر والے اس کے رشتے کا انتظام کرتے ہیں۔ شادی کے بعد فطری طور پر اخراجات بڑھ جاتے ہیں۔ دو بچے پیدا ہو جانے کے بعد فرید مالی مسائل کا شکار ہو کر کارخانے کے مالک کے پاس تنخواہ میں اضافے کی استدعا کرتا ہے۔ فرید اور کارخانے دار داؤد کا مکالمہ ملاحظہ ہو:

> "میرے راستے میں ایک رکاوٹ ہے"۔۔۔۔۔
>
> وہ کچھ دیر خاموش رہا، پھر بولا "میری تنخواہ میں اضافہ کر دیں"
>
> "مگر کیوں میں؟"
>
> "میں سمجھتا ہوں یہ میرا حق ہے، کئی سالوں سے کام کر رہا ہوں۔"
>
> "یہ ایک بغاوت ہے، کھلی بغاوت" داؤد چلانے لگا "میں تمہاری درخواست رد کر دوں تو؟"
>
> "تو مجھے یہ نوکری چھوڑنا پڑے گی"۔(۱۰)

داؤد فرید کو نوکری سے نکال دیتا ہے۔ اب فرید جہاں بھی نوکری کے لیے جاتا ہے، داؤد وہاں پہنچ کر نئے مالک کے کان بھرتا رہتا ہے، یوں فرید کو ہر جگہ نوکری سے نکالا جاتا ہے۔ یوں فرید معاشی طور پر حد درجہ تنگ دست ہو جاتا ہے۔ داؤد فرید کی بیوی خانم کو مالی مدد کے بہانے اپنے کارخانے بلاتا ہے۔ اتفاقاً فرید اپنی بیوی کا تعاقب کرتا ہے۔ چونکہ کارخانہ کی عمارت اور حفاظتی اقدامات سے فرید واقف ہوتا ہے، اس لیے فرید بہ آسانی داؤد کے نجی کمرے تک پہنچ جاتا ہے۔ جہاں خانم اور داؤد موجود ہوتے ہیں۔ داؤد جب خانم کو جنسی تلذذ کے بدلے خطیر رقم پیش کرتا

ہے، تو خانم غصہ ہو کر باہر نکلنے کی کوشش کرتی ہے۔ لیکن دادو پستول نکال کر ڈرانے دھمکانے پر آجاتا ہے۔ فرید اندر داخل ہو کر دادو کے ساتھ لڑنے لگتا ہے۔ لڑائی کے دوران گولی چل جاتی ہے اور دادو مر جاتا ہے۔ مصنف نے یہ تلخ حقیقت بیان کی ہے کہ ہمارے ہاں دولت کے بل بوتے پر مالدار طبقہ غرباء کا جنسی وہ جسمانی استحصال کرتے رہتے ہیں۔ کیونکہ یہ بورژوا طبقہ تمام نظام پر کنٹرول رکھنے میں ماہر ہے۔ دوسری طرف غریب طبقہ مالی مسائل کے گرداب میں گرفتار ہے۔ ان کے رویے، چال چلن، نفسیاتی محرومیوں اور غربت کے اثرات نے انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ مس ثروت وہاب کا کردار بابا (افسانہ "بابا" مجموعہ: "خواب جب ٹوٹتے ہیں") (۱۱) جاگیردار کا قرضہ چکانا چاہتا ہے، کیونکہ جاگیردار پچاس ہزار روپے قرض کے بدلے جواں سالہ میمونہ سے شادی رچانا چاہتا ہے۔ بابا مجبوراً اپنا گردہ نکال کر فروخت کرتا ہے۔ یوں جاگیردار کا قرضہ چکانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ غربت کی اس چکی میں خطے کے تمام لوگ پس رہے ہیں۔

اشرف حسین احمد کا افسانہ "شنیدی گل" تیسری جنس سے تعلق رکھنے والے ایک فرد شنیدی گل کا درد بھرا قصہ ہے۔ شنیدی گل ایک خوب رو لختئی (ناچنے والا لڑکا) ہے۔ غربت کی وجہ سے والدین اسے فروخت کرتا ہے اور اب وہ مختلف لوگوں میں فروخت ہوتا رہتا ہے۔ میرا خان نامی گرو اس کو ناچ گانے کا فن سکھانے کی کوشش کرتا ہے لیکن شنیدی گل اس فن سے نفرت کرتا ہے۔ یوں میرا خان کو سخت کوفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ راوی کردار کو شنیدی گل اس بابت کہتا ہے کہ:

> "بابو صاب! پیر بابا کی قسم، اس سارے بازار میں میرے سامنے کوئی پشواز بھی نہ پہن سکے۔ لیکن کن کے سامنے ناچوں، ان کے سامنے جن کی آنکھیں میرا ناچ نہیں، میری پشواز کے دائرے اور ان میں چھپے ہوئے زاویوں کو عریاں دیکھنا چاہتی ہیں۔ وہ میرے آرٹ کے بھوکے نہیں، میری عزت کے شکاری ہیں۔ بابو صاب! یہ لوگ مجھے فنکار سے بیسوا بنانا چاہتے ہیں۔" (۱۲)

شنیدی گل سے مالی فائدہ نہ ہونے کی وجہ سے میرا خان اس کو لٹو نامی شخص پر فروخت کرتا ہے۔ لٹو اگرچہ شنیدی گل کے ساتھ بظاہر ہمدردانہ رویہ رکھتا ہے، تاہم مالی فائدے کے لیے وہ اسے رحیم خان نامی جاگیردار کے حجرے بھیج دیتا ہے۔ رحیم خان شنیدی گل کا عاشقِ صادق خود کہتا ہے۔ حجرہ میں وہ شنیدی گل سے نفسانی خواہشات کی تکمیل کی خواہش کا اظہار کرتا ہے۔ شنیدی گل کے انکار پر وہ جبر و تشدد کا راستہ اختیار کرتا ہوا اسے گولی مار دیتا ہے۔ شنیدی گل زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے مر جاتا ہے اور رحیم خان علاقہ غیر پہنچ کر قانون کی نظروں سے خود کو بچا لیتا ہے۔ ظاہر ہے معاملہ ٹھنڈا ہونے پر رحیم خان دوبارہ اپنے گھر آجائے گا اور دوبارہ اپنے عیاشی کا سلسلہ جاری رکھے گا تاہم شنیدی گل اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ پروفیسر خالد سہیل ملک نے افسانہ "مدھو بالا" (۱۳) میں مدھو بالا نامی فرد کی غربت کی کہانی پیش کی ہے، جو کسی زمانے میں حسن کا پیکر ہوا کرتا تھا۔ جس کے نام علاقے کے جاگیردار نے پورا گاؤں کر دیا تھا۔ پھر متعلقہ جاگیردار کی وفات کے بعد، اس کے لواحقین نے مدھو بالا کو اس جائیداد سے محروم کر دیا۔ لمحۂ موجود میں مدھو بلا شدید غربت زدہ زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے۔ آسیہ بی بی نے افسانہ "ٹرانس جینڈر" کے ذریعے نازلی نامی فرد کی کہانی بیان کی ہے۔ نازلی سے ہر کوئی مالی فائدہ حاصل کرنا چاہتا ہے، لیکن اس کی دلی کیفیات

کو سمجھنے والا کوئی نہیں۔ والدین ہو، گروپ ہو یا عامر نامی نوجوان، ان تمام افراد کی نظر میں نازلی صرف روپیہ بنانے والی مشین ہی ہے۔ جو جذبات واحساسات سے عاری ہی ہے۔ نازلی جب عامر سے اپنے مستقبل کو وابستہ کر کے، اس کے ساتھ بھاگ جاتا ہے، تو عامر کی نظر اس بیگ پر ہے جس میں نازلی نے اپنا تمام اثاثہ جمع کیا ہے۔ کہانی کا انجام مصنفہ نے کچھ یوں دکھایا ہے:

"وہ بیگ بغل میں دبائے عجلت سے باہر لپکا۔ سوتی ہوئی نازلی کے چہرے کی چمک نے اس کو کچھ لمحوں کے لیے مدہوش کر دیا۔ مگر بیگ بہت بھاری تھا وہ عجلت سے باہر لپکا۔"(۱۴)

مندرجہ بالا اجمالی تحقیقی جائزے سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ خیبر پختونخوا میں ایک کثیر تعداد کو غربت کا سامنا ہے۔ جس کی وجہ سے معاشرے میں عدم استحکام، نفرت، اقرباءپروری، بربریت اور انتہا پسندی کا بازار گرم ہے۔ معاشی ناہمواری میں کمی کے لیے تعلیم ایک بہترین سیڑھی ہے، کیونکہ اس راستے سے شعور کا سفر ممکن ہو سکتا ہے، لیکن قابل افسوس امر یہ ہے کہ تعلیم کے دروازے غرباء پر روز بہ روز بند ہوتے جا رہے ہیں۔ اس ظلم وجبر کے ماحول کی عکاسی خیبر پختون خوا کے اردو ادب میں عموماً اور صنف افسانہ میں خصوصاً تواتر کے ساتھ موجود ہے۔

حوالہ جات:

۱۔ رضا ہمدانی، "غوبل"، گوشۂ ادب، لاہور، ۱۹۵۴ء، ص ۲۸۶

۲۔ فہمیدہ اختر، "اپنے دیس میں"، استقلال پریس، لاہور، ۱۹۶۱ء، ص ۵۳

۳۔ مسز منور رؤف، "انمول رتن"، ایم۔ جے بکس انٹرنیشنل، پشاور صدر، پشاور، ۱۹۷۴ء، ص ۱۸۲،۱۸۱

۴۔ اختر نواز خان، ڈاکٹر، "ایک ہی کہانی"، القلم پبلی کیشنز، صدر بازار ہری پور، آگست ۲۰۰۲ء، ص ۵۳

۵۔ سحر یوسف زئی، "آگ اور سائے"، مکتبہ میری لائبریری، لاہور، ۱۹۶۷ء، ص ۱۳۲

۶۔ قیوم مروت، "سرف شرفاء کے لیے"، گلشن ادب پبلی کیشنز، سنت نگر، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص ۲۰۵

۷۔ زیتون بانو، "زندہ دکھ"، مقبول اکیڈمی، سرکلر روڈ، چوک انار کلی، لاہور ۱۹۹۸ء، ص ۵۲

۸۔ ڈاکٹر اختر نواز خان، "ایک ہی کہانی"، القلم پبلی کیشنز، صدر بازار، ہری پور، آگست، ۲۰۰۲ء، ص ۵۳

۹۔ شمیم فضل خالق، "بدلتے موسموں کے رنگ"، ملت ایجوکیشنل پرنٹرز، لاہور، ۲۰۰۰ء، ص ۱۴۶

۱۰۔ محمود شوکت، "دورستے"، شوکت ہومیو کلینک، کوہاٹ کینٹ، کوہاٹ، ۱۹۹۵ء، ص ۲۰

۱۱۔ مس ثروت وہاب، "خواب جب ٹوٹتے ہیں"، بلال پریس بٹ خیلہ، نومبر ۲۰۰۸ء، ص ۲۴

۱۲۔ اشراف حسین، "شنیدی گل" (مشمولہ: "پشتو افسانے"، ترجمہ: رضا ہمدانی) نیا مکتبہ، پشاور، ۱۹۶۱ء، ص ۷۹

۱۳۔ خالد سہیل ملک، "مون سون"، ملک پرنٹرز، پشاور، ۱۵ دسمبر ۲۰۲۳ء، ص ۶۱

۱۴۔ آسیہ بی بی، "ڈوبتے چاند کا آخری منظر"، کونپلیں پبلشرز، پشاور ستمبر ۲۰۲۵ء، ص ۹۷